باسمہ تعالیٰ

به سلسلهٔ آئین سازی

کتاب و سنّت

کی صحیح پوزیشن

اور علمائے کرام کے باہمی اختلافات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

کتاب و سنّت

آئین کمیشن کے سوالنامے کے جوابات طلوع اسلام کی طرف سے مرتب اور شائع کئے گئے ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ مجوزہ آئینِ پاکستان کی پہلی اساسی اور اصولی شق یہ ہونی چاہیئے کہ

مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا اور مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔

طلوعِ اسلام کا مطالبہ

طلوع اسلام کا یہ مطالبہ نیا نہیں۔ اس نے تحریک پاکستان کی ابتدا اسی وجہ سے کی تھی کہ اس کے نزدیک مملکتِ پاکستان کی عمارت قرآن کریم کی غیر متبدل بنیادوں پر استوار ہونی تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد طلوع اسلام آئین سازی کے سلسلہ میں اپنے اس مطالبہ کو مسلسل اور متواتر دہراتا رہا۔ اب جبکہ آئین سازی کا مسئلہ دوبارہ زیرِ غور ہے اس نے اس مطالبہ کو پھر پیش کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس مطالبہ کے حق میں فضا اس قدر سازگار ہو گئی ہے کہ اس سے پہلے مغرب کی مادہ پرستی سے متاثر اور روس کی کمیونزم کے دلدادہ گروہوں کی طرف سے اس کی جو مخالفت ہوا کرتی تھی، اب اس کی آواز کہیں سے سنائی نہیں دی۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

قرآن کی مخالفت

لیکن ایک گروہ ایسا ہے جو اس مطالبہ کی مخالفت میں اب بھی ویسا ہی سرگرم ہے جیسا پہلے تھا۔ یہ گروہ ہمارے علمائے کرام کا ہے۔ انہوں نے سابقہ آئین سازی کے زمانے میں بھی اس مطالبہ کی مخالفت کی تھی اور اب پھر اس کی مخالفت شروع کر دی ہے چنانچہ اگلے دنوں لاہور میں مختلف فرقوں کے بیس نمائندگان کا اجتماع ہوا جس میں آئین کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات متفق طور پر مرتب کئے گئے۔ ان جوابات میں کہا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۵۶ء کے (منسوخ شدہ) دستور کو بحال کیا جائے کیونکہ وہ صحیح اسلامی دستور تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس دستور میں یہ دفعات رکھی گئی تھیں کہ

(۱) مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اور

(۲) جہاں تک شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) کا تعلق ہے "کتاب و سنت" کی تعبیر مسلمانوں کے مسلمہ فرقوں کے عقائد کے مطابق کی جائے گی۔

بالفاظِ دیگر ان علمائے کرام کی طرف سے جس مطالبہ کا اعادہ کیا گیا ہے، اور جس کی بنا پر یہ حضرات خیال کرتے ہیں کہ آئین صحیح اسلامی کہلا سکتا ہے، یہ ہے کہ

(۱) مملکت میں کتاب کے ساتھ سنت کو بھی برابر کی بنیادی حیثیت دی جائے اور کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے جو سنت کے خلاف ہو۔

(ہم نے "برابر کی حیثیت" اس لئے لکھ دیا ہے کہ ان حضرات نے "کتاب و سنت" کا ذکر کرتے وقت بظاہر ان میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ورنہ جیسا کہ آگے چل کر سامنے آئے گا، ان کے مطالبہ کی رُو سے کتاب اللہ کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ سنت قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے)

(۲) مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو آئینی سند عطا ہو جائے۔ اور

(۳) قانون کے دو حصے کئے جائیں، شخصی اور ملکی۔

کتاب و سنت

طلوعِ اسلام میں ان مسائل کے متعلق اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن چونکہ انہیں (اور بالخصوص "مقامِ سنت" کے سوال کو) آئین کے سلسلہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مقام پر ایک بار پھر تفصیل سے بات کی جائے کہ کتاب کے ساتھ سنت کے اضافہ کا عملی نتیجہ کیا ہے اور ہم نے اسے کیوں حذف کیا ہے۔

سنت سے مفہوم سنتِ رسول اللہ (صلعم) ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ موضوع کس قدر نازک ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کی نسبت حضور اقدس و اعظم کی ذاتِ گرامی کی طرف ہو جائے اس کا تعلق ہمارے گہرے جذبات سے ہو جاتا ہے اور جن امور کا تعلق جذبات سے ہو ان کے متعلق گفتگو بڑی نزاکت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ موضوع تو پھر بھی رسول اکرمؐ کی سنت سے

موضوع کی نزاکت

متعلق ہے۔ اس باب میں ہمارے جذبات کی نزاکت کا تو یہ عالم ہے کہ اگر کسی پتھر کے ٹکڑے کے متعلق مشہور ہو جائے کہ اس پر حضورؐ کا نقشِ پا مرتسم ہے تو اس نسبت سے اس پتھر کی عظمت و احترام کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ کوئی شخص اس کے خلاف ایک لفظ تک سننا گوارا نہیں کرتا۔ ان حالات کے ماتحت ذرا سوچئے کہ اگر کسی کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ وہ آئینِ پاکستان میں سنتِ رسول اللہؐ کو شامل نہیں ہونے دینا چاہتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہمیں افسوس (اور انتہائی صدمہ) ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے علم و حقائق کی روشنی میں غور کرنے کے بجائے، ہمیشہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا مسلک اختیار کیا ہے۔ اور کبھی اتنا سمجھنے

کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ طلوع اسلام اس باب میں کیا کہتا ہے؟ ہم ان حضرات کی خدمت میں بالعموم اور ملک کے دوسرے باہوش طبقہ سے بالخصوص عرض کریں گے کہ جو کچھ آئندہ سطور میں پیش کیا جاتا ہے خدا کے لئے اسے ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ اس سوال کا آئین پاکستان سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔ یہ سوال کس قدر عمیق فکر و تدبر کا محتاج ہے اور اگر اس کے متعلق ٹھنڈے دل سے نہ سوچا گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

آئین پاکستان کے سلسلہ میں ایک گروہ کی طرف سے ہمیشہ یہ سوال سامنے لایا جاتا رہا ہے کہ جس ملک میں اس قدر مذہبی فرقے موجود ہوں اور ان فرقوں میں اس قدر باہمی اختلافات ہوں وہاں ایک متفق علیہ اسلامی آئین کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے؟ ہمارے علمائے کرام کی طرف سے اس اعتراض کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ کراچی میں مختلف فرقوں کے بائیس علماء نے متفقہ طور پر آئین کا مسودہ پیش کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اتفاق اور اتحاد کا ثبوت اور کیا دیا جا سکتا ہے؟ اسی اتفاق و اتحاد

علماء کا متفقہ مطالبہ

کا مظاہرہ اب لاہور کے اکتیس علماء کی طرف سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا بظاہر یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے کہ جب مختلف فرقوں کے نمائندے متفقہ طور پر ایک مطالبہ پیش کرتے ہیں تو پھر ان کے باہمی اختلافات کا سوال کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟ لیکن ذرا دیکھئے کہ وہ متفقہ مطالبہ کیا ہے؟ وہ مطالبہ یہ ہے کہ آئین پاکستان کی بنیاد "کتاب و سنت" پر رکھی جائے۔ اور ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہ ہو جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ اس متفق علیہ مطالبہ کی حقیقت کیا ہے؟

جب ہم "قرآن" کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو ہر مسلمان فوراً سمجھ لیتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس سے مراد ایک کتاب ہے جس میں الحمد سے والناس تک جو کچھ لکھا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم پر بذریعہ وحی کے

قرآن کریم

نازل کیا تھا اور وہ لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً ہم تک محفوظ شکل میں پہنچا ہے۔ اس کے زیر بحث ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں[1]۔ لہٰذا جب ہم کہیں کہ پاکستان میں کوئی بات قرآن کے خلاف نہیں ہوگی تو اس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ قرآن سے مفہوم کیا ہے۔ نہ ہی اس باب میں کبھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ فلاں آیت جسے آیت قرآنی کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے، قرآن کی آیت ہے یا نہیں۔ آیت تو ایک طرف اگر کوئی شخص اس میں ایک لفظ کا رد و بدل کرے تو سینکڑوں آوازیں بیک وقت پکار اٹھیں گی کہ وہ قرآن کا لفظ نہیں ہے۔

سنت کسے کہتے ہیں؟

سوال یہ ہے کہ کیا سنت کی بھی یہی کیفیت ہے؟ جب ہم "سنت" کا لفظ بولتے ہیں تو کیا اس سے ہر مسلمان کا ذہن کسی خاص کتاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے متعلق

---

[1] یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنی آیات کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ سردست بحث قرآن کریم کے متن تک محدود ہے۔

اس کا ایمان ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ "سنت" ہے؟ اور کیا اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک قرآن کے متن کی طرح متفق علیہ اور تنقید کی حد سے بلند ہے؟ اس سوال کا جواب پہلے آپ خود اپنے دل سے مانگیے اور دیکھیے کہ کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسی کتاب آتی ہے جسے آپ سنتِ رسول اللہ کا اسی طرح مستند مجموعہ سمجھتے ہوں جس طرح قرآن کریم کو وحی خداوندی کا مجموعہ سمجھتے ہیں؟ اس کے بعد آپ ان ایس علماء کرام سے دریافت کیجئے کہ کیا وہ کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر سکتے ہیں جو تمام علماء امت کے نزدیک تو ایک طرف، ان ایس علماء کے نزدیک قرآن کریم کی طرح متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو؟ آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ یہ حضرات اس بات پر بھی آپس میں متفق نہیں کہ سنت کسے کہتے ہیں! آپ کو یہ دعوے کچھ تعجب انگیز سا دکھائی دے گا لیکن یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ آپ خود اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ آپ خط لکھ کر ان سے دریافت کریں اور پھر دیکھیں کہ ان کی طرف سے اس استفسار کا جواب کیا موصول ہوتا ہے؟

اس اجتماع میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے نمائندے شامل تھے۔ ہم چاہتے تو شرح و بسط سے بتا سکتے تھے کہ سنت کے مسئلہ میں ان فرقوں کے بانیوں کے یا ان کے دیگر اکابر سلف کے باہمی اختلافات کس قدر شدید تھے۔ لیکن یہ انداز اختیار کرنے کے بجائے ہم نے اسے زیادہ مناسب سمجھا ہے کہ بتایا جائے کہ جو حضرات اس اجتماع میں شریک تھے اور جن کی طرف سے یہ متفقہ مطالبہ پیش کیا گیا ہے، سنت کے بارے میں خود ان میں کس قدر سخت اختلافات ہیں۔ ان میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب تھے جو جماعت اہلحدیث گوجرانوالہ کے خطیب ہیں (ان کے ساتھ مولانا محمد داؤد غزنوی۔ اور مولانا محمد اسحٰق صاحب ناظم الاعتصام تھے جو اسی مکتبِ فکر سے متعلق ہیں)۔ دوسری طرف مولانا محمد شفیع صاحب (دیوبندی)، مولانا ابوالحسنات قادری صاحب، امیر حزب الاحناف پاکستان (اور ان کے دیگر ہم خیال حضرات) حنفی مکتبِ فکر کے نمائندہ تھے (اگرچہ ان میں بھی دیوبندی اور بریلوی حضرات کے باہمی اختلافات ہیں)۔ ندوۃ کے نمائندہ مولانا محمد حنیف صاحب تھے۔ (سابق) جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سنت کے متعلق ان حضرات کے باہمی اختلافات کس قدر ہیں۔ واضح رہے کہ ان کے یہ اختلافات "سنت" کی تعبیر کے اختلافات نہیں۔ اختلافات اس امر پر ہے کہ (۱) سنت کہتے کسے ہیں اور (۲) فلاں حدیث جو پیش کی جا رہی ہے وہ رسول اللہ کی حدیث ہے بھی یا نہیں۔

باہمی اختلاف

چند ہی سال ادھر کا ذکر ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث"۔ اس میں انہوں نے مودودی صاحب (اور ان کے ہم نواؤں) کے مسلکِ حدیث پر سخت تنقید کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ حضرات "سنت" سے جو مفہوم لیتے ہیں اس سے ان کے مسلک کے ڈانڈے منکرینِ حدیث سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رسالہ میں منکرینِ حدیث کی جو فہرست شائع کی تھی اس میں سر سید، مولانا شبلی، مولانا حمید الدین فراہی کے ساتھ مودودی صاحب، امین احسن اصلاحی صاحب اور عام فرزندانِ ندوہ کو بھی شامل کیا تھا۔ اگرچہ ان کے متعلق لکھا تھا کہ

یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے انداز فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے۔ اور طریق گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔ (صفحہ [illegible])

مولانا اسمٰعیل صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ سنت اور حدیث مرادف الفاظ ہیں۔ یعنی حدیث ہی کو سنت کہا جاتا ہے۔ ان کی اس تعریف کی رُو سے "کتاب و سنت" کے معنی ہوں گے "قرآن و حدیث" لیکن مودودی صاحب کے نزدیک سنت کا مفہوم اس سے الگ ہے۔ وہ اپنی کتاب "رسائل و مسائل" میں لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب کے نزدیک

سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بہ حیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے[1]۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزء سنت ہے اور کونسا جزء عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔۔۔۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلعم تشریف لائے تھے۔ اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی بناء پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا (صفحہ [illegible] تا صفحہ [illegible])

---

[1] ممکن ہے اس مقام پر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مودودی صاحب سے یہ پوچھیں کہ اس سے پہلے آپ یہ لکھ چکے ہیں کہ

جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپؐ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے۔ مربی اور مزکی بھی تھے قاضی اور حاکم بھی تھے۔ امام اور امیر بھی تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے حالات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔ (تفہیمات حصہ اول۔ صفحہ [illegible])

اور اب آپ حضورؐ کی شخصی زندگی اور رسالت کی زندگی کو الگ الگ قرار دے رہے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ کیا ہے؟ مودودی صاحب کے ہاں اس قسم کے تضادات عام ملیں گے۔

اسی کتاب میں وہ صفحہ [illegible] پر لکھتے ہیں۔

> بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس طرز خاص کا لباس نبی پہنتے تھے اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ اُن بدعات کے ہے جن سے نظامِ دین میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی مولانا اسماعیل صاحب کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنتِ رسول اللہؐ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ

> میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً صفحہ [illegible])

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں۔

> جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں انھیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ (صفحہ [illegible])

اس کا نتیجہ

ان تصریحات کی روشنی میں ایک عملی شکل کو سامنے لائیے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی جاتی ہے کہ یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو کتاب و "سنت" کے خلاف ہو۔ ایک قانون ملک میں نافذ ہو جاتا ہے۔ مولانا اسماعیل صاحب چیلنج کرتے ہیں کہ وہ "سنت" کے خلاف ہے اس لئے وہ قانون ناجائز ہے۔ اس کی تائید میں وہ ایک حدیث پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مودودی صاحب تشریف لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ قانون سنت کے خلاف نہیں۔ مولانا اسماعیل صاحب دریافت کرتے ہیں کہ انھوں نے جو حدیث پیش کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟

مودودی صاحب جواب دیتے ہیں کہ وہ حدیث تو صحیح ہے لیکن رسول اللہ نے وہ عمل اپنی بشری حیثیت سے عادۃً فرمایا تھا رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں کیا تھا۔ مولانا اسماعیل صاحب پوچھتے ہیں کہ اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ حضورؐ نے وہ کام عادتاً کیا تھا۔ مودودی صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے۔

> جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کرکے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔۔۔۔۔ اس مقام پر پہونچ جانے کے بعد اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس فاسد پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادہ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات، حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۳ تا صفحہ ۳۲۴)

مولانا اسمٰعیل صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

> اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول کا مزاج شناس تصور کرے۔ پھر اسے اختیار دیدے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلاوجہ کسی موضوع یا مختلق۔ مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعوے کر دے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے۔ اور سنتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔
>
> (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث صفحہ ۶۳)

یعنی جس چیز کو مودودی صاحب سنت رسول اللہ قرار دیتے ہیں اسے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنت کے خلاف ہوائی حملے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور سنت کو ایسے حملوں سے محفوظ رکھنے کو اپنا فریضہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے باوجود دونوں کا دعویٰ ہے کہ ہمارا مطالبہ متفق علیہ ہے۔

اصلاحی صاحب

یہاں تک بات صرف مودودی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب کے درمیان تھی۔ اس کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ

> حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی صلعم کی نسبت کے ساتھ کی جائے۔ لیکن سنت سے مراد نبی صلعم کا صرف ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپؐ نے بار بار عمل کیا ہو۔ جس کی آپؐ نے محافظت فرمائی ہو۔ جس کے حضورؐ عام طور پر پابند رہے ہوں۔
>
> (ایضاً، صفحہ ۲۵)

اس کے متعلق مولانا اسماعیل صاحب فرماتے ہیں۔

> مولانا اصلاحی نے سنت کی تعریف کو اس قدر سکیڑ دیا ہے کہ اس کا تعلق صرف چند اعمال سے ہی ہوگا جن کا ثبوت آنحضرتؐ سے علی سبیل الاستمرار ہے جیسے نماز کے بعض ارکان…… ہزار دفعہ فرمایا جائے کہ "اگر کوئی شخص اس سنت کو ماخذِ دین تسلیم نہیں کرتا تو میں اسے مسلمان تسلیم نہیں کرتا۔" سوال یہ ہے کہ اس سنت کی چنائی ہے کہاں تک —— اس کا احاطہ چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ سے ہی ثابت کرنا ہوگا۔ پھر اس ادعا کی ضرورت ہی کیا ہے۔
>
> (ایضاً صفحہ ۲۶)

یہ ہے "سنت" کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق ان حضرات کا وہ اختلاف جس کی بنا پر مولانا اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں کہ

> میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہل حدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال و تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔
>
> (ایضاً صفحہ ۱۱۰)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب و سنت" کا متفقہ مطالبہ کرنے والوں میں اس امر پر بھی اتفاق نہیں کہ "سنت" کہتے کسے ہیں؟ "جو چیز ایک کے نزدیک "سنت" ہے وہ دوسرے کے نزدیک "بدعت" اور دین میں تحریف" ہے۔

حدیث

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ صحیح احادیث کی موجودگی میں بھی یہ ممکن نہیں کہ یہ حضرات "سنت" کا کوئی متفق علیہ مجموعہ پیش کر سکیں۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ان حضرات کے پاس احادیث کا کوئی ایسا مجموعہ ہے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ قطعاً نہیں۔ احادیث کے بے شمار مجموعے ہیں۔ مولانا سندھی (مرحوم) کے الفاظ میں ——

میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں۔ تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہو گئی۔

(مقام حدیث جلد اول ص ۲۴۹)

یعنی (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تحقیق کے مطابق) احادیث کے قریب پچاس مجموعے ہیں اور سب میں غلط اور صحیح احادیث ملی جلی ہیں۔ ان میں چھ کتابوں کو "صحاح ستہ" (یعنی صحیح کتابیں) کہا جاتا ہے۔ ان میں بھی اختلاف ہے کہ یہ چھ کون کون سی ہیں۔ لیکن ان میں سے بخاری اور مسلم کو سب سے اونچا درجہ دیا جاتا ہے۔ پھر ان دونوں میں بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔

• حدیث کے متعلق مولانا اسماعیل صاحب فرماتے ہیں۔

قرآن اور حدیث کی ایک حیثیت ہے

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا۔۔۔۔۔۔ جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں۔ ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔

(ایضاً ص ۳۳)

بخاری اور مسلم کے مجموعوں کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے۔۔۔۔۔۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے (ایضاً ص ۵۵)

بالفاظ دیگر مولانا اسمٰعیل صاحب کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کے انکار کا وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ہے ان احادیث کا انکار کفر ہے اور ایسا کرنے والا مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

جبرئیل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ (ایضاً ص ۷۰)

یعنی قرآن اور حدیث دونوں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی حضورؐ کو ملتے تھے اور دونوں کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں اب دیکھئے اس باب میں مودودی صاحب کیا فرماتے ہیں۔

مودودی صاحب کا مسلک

قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا

> نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف اسٹائل کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جب کہ نبی صلعم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔
>
> (ترجمان القرآن بابت ستمبر سنہ ۱۹۵۲ء)

اس سے مودودی صاحب نے واضح کر دیا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا یہ ارشاد کہ احادیث بھی قرآن کی طرح منزل من اللہ وحی ہیں صحیح نہیں۔ قرآن خدا کا کلام ہے۔ اور احادیث نبی اکرمؐ کا اپنا کلام۔ اور دونوں کا فرق بالکل بدیہی اور واضح ہے۔

دوسرے مقام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

> ان امور کے متعلق (یعنی دجال کے متعلق) جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے ...... یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں جس کے صحیح ثابت ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف کئے گئے ہوں۔ (رسائل و مسائل صفحہ ۵۶-۵۵)

اس کے بعد وہ رسائل و مسائل صفحہ ۶۷ پر لکھتے ہیں۔

> احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقینی۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو۔ انہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں۔

مودودی صاحب نے یہ خیالات ظہور مہدی سے متعلق احادیث ہی کے سلسلہ میں ظاہر فرمائے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ صرف ظہور مہدی سے متعلق احادیث کو ایسا سمجھتے ہیں۔ تمام احادیث کے متعلق ان کے یہی خیالات ہیں۔ چنانچہ وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

نبی صلعم کے قول و فعل کو میں بھی قرآن کی طرح حجت مانتا ہوں اور میرے نزدیک جو عقیدہ حضورؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم آپؐ نے ارشاد فرمایا ہو وہ اسی طرح ایمان و اطاعت کا مستحق ہے جس طرح کوئی ایسا عقیدہ یا حکم جو قرآن میں آیا ہو۔ لیکن قول رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلعم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔

(رسائل و مسائل صفحہ ۲۷)

آگے چل کر فرماتے ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔

(ایضاً صفحہ ۲۹)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک، احادیث کے پرکھنے کی کسوٹی "مزاج شناسِ رسولؐ" کی نگہِ بصیرت ہے جس حدیث کو وہ صحیح کہہ دے، وہ صحیح ہوگی۔ جسے وہ غلط قرار دیدے وہ غلط قرار پا جائے گی۔ لیکن اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں کہ کسی کی "نگہِ بصیرت" دوسرے کے لئے سند نہیں قرار پا سکتی۔ وہ فرماتے ہیں۔

اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی چیز شرعی ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو شرعی کہتی ہے وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۳۳۱)

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) جو عقیدہ نبی اکرمؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم حضورؐ نے دیا ہو اس پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآن میں بیان کردہ عقیدہ یا حکم پر ایمان لانا اور اس کی

اطاعت کرنا۔

(ii) جو کچھ نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا وہ احادیث کی کتابوں میں منقول ہے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ سب کچھ نبی اکرمؐ کا فرمودہ ہے۔ وہ صرف رسول اللہ کی طرف منسوب ہے۔

(iii) اس کا فیصلہ کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو کچھ رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس میں فی الواقعہ رسول اللہؐ کا فرمودہ کیا ہے اور وہ کون سی باتیں ہیں جنھیں حضورؐ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔

(iv) اس چیز کا فیصلہ "مزاج شناسِ رسولؐ" کی نگہِ بصیرت ہی کر سکتی ہے۔

(v) لیکن نگہِ بصیرت ہر شخص کی الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ایک شخص فرمودۂ رسولؐ قرار دے اسے دوسرا شخص بھی بالضرور فرمودۂ رسولؐ تسلیم کر لے۔

مودودی صاحب منکرِ حدیث ہیں

مودودی صاحب کے انہی خیالات کو پڑھ کر، مولانا ظفر احمد عثمانی صدر جمعیت علمائے اسلام پاکستان نے اپنے فتوے میں لکھا تھا کہ

یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ گمراہ اور مبتدع ہے۔ جاہل اجہل ہے یا گل ہے۔ (مقام حدیث۔ جلد دوم ص [illegible])

قطع نظر اس کے کہ مودودی صاحب کے متعلق اہلِ حدیث اور حنفی علماء کے خیالات کیا ہیں، غور طلب بات یہ ہے کہ حدیث کے متعلق جو نظریہ انھوں نے بیان فرمایا ہے اس کا عملی نتیجہ کیا ہوگا۔ اگر دین انفرادی چیز ہو تو ہو سکتا ہے کہ جس بات کو زید اپنی نگہِ بصیرت کے مطابق فرمودۂ رسولؐ سمجھے وہ اس پر عمل کرے اور جسے بکر اپنی بصیرت کے مطابق فرمودۂ رسولؐ سمجھے

عملی نتیجہ

وہ اس پر عمل پیرا ہو جائے۔ دونوں کو ان کی حسنِ نیت کا ثواب مل جائے گا۔ لیکن جب آپ فرمودۂ رسولؐ کو مملکت کے آئین اور حکومت کے قوانین کی غیر متبدل اور ابدی بنیاد قرار دے دیں اور اس امر کا فیصلہ کر دیں کہ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "فرمودۂ رسولؐ" کے خلاف ہو اور کسی بات کے "فرمودۂ رسولؐ" ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ افراد کے ذوق اور بصیرت کے مطابق ہو تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا اس وقت پاکستان میں کوئی قانون کبھی بن سکے گا؟

مولانا اسماعیل صاحب نے فرمایا تھا کہ صحیحین۔ یعنی بخاری اور مسلم کی سب احادیث صحیح ہیں اور ان میں سے کسی کا انکار کفر ہے۔ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں کہ

بخاری کی احادیث

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی چوں و چرا بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر، دسمبر [illegible])

یہ خیال تنہا مودودی صاحب ہی کا نہیں۔ پاکستان میں اکثریت حنفی مسلمانوں کی ہے۔ اسی مکتب فکر کے ایک جید عالم، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، صدر مدرس جامعہ اشرفیہ ٹنڈوالہیار (جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) اپنے ایک مکتوب گرامی میں فرماتے ہیں

> حنفیہ کے نزدیک بھی کتاب البخاری ومسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہیں۔ اور مسلم پر بخاری کو ترجیح ہے۔ مگر اس سے وہ مواضع مستثنےٰ ہیں جن پر دارقطنی وغیرہ محدثین نے تنقید کی ہے کہ ان کی صحت پر اتفاق نہیں بلکہ محل اختلاف ہیں۔ دارقطنی وغیرہ نے تقریباً دو سو احادیث پر تنقید کی ہے جو بخاری ومسلم میں موجود ہیں۔ ان مواضع کے سوا بقیہ کی صحت پر اتفاق ہے۔
>
> (طلوع اسلام۔ اگست سنہ ۱۹۵۹ء۔ صفحہ ۴۲)

بخاری ومسلم کی احادیث کے متعلق یہ عقیدہ حنفی علماء کا ہے۔ بخاری کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے جماعت اہل حدیث کے سرخیل، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) ترجمان القرآن۔ جلد دوم (صفحہ ۹۹-۱۰۰) میں لکھتے ہیں کہ

> روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ (بخاری کی روایت دربارہ کذب حضرت ابراہیمؑ) اللہ کے رسول کا قول نہیں ہوسکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔

یعنی مولانا آزاد (مرحوم) کے نزدیک بخاری اور مسلم میں بھی ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں قول رسولؐ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اَحادیث مرتب کیسے ہوئی تھیں؟

اس مقام پر مختصر طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ احادیث کے یہ مجموعے (مثلاً بخاری وغیرہ) مرتب کس طرح ہوئے تھے؟ یہ واقعہ ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ

(۱) نبی اکرمؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کرا کر امت کو نہیں دیا۔

(۲) نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اس قسم کا کوئی مجموعہ مرتب کیا (انھوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)۔

(۳) رسول اللہ کی وفات سے قریب اڑھائی سو سال بعد امام محمد بن اسمٰعیلؒ نے (جو بخارا کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے سنہ ۲۵۶ھ میں وفات پائی) اپنے طور پر احادیث کو جمع کرنا شروع کیا۔ ان کے سامنے کوئی تحریری ریکارڈ نہیں تھا۔ انھوں نے ان روایات کو جمع کیا جو زبان زد خلائق تھیں اور جنہیں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ مثلاً اس کا طریق یہ تھا کہ جس شخص نے امام بخاریؒ سے کوئی روایت بیان کی اس نے کہا کہ میں نے یہ بات فلاں

صاحب سے سنی تھی۔ انھوں نے فلاں سے سنی۔ انھوں نے فلاں سے۔ انھوں نے فلاں صحابیؓ سے جنھوں نے کہا کہ رسول اللہ نے یوں ارشاد فرمایا تھا۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ اس طرح انھوں نے قریب چھ لاکھ احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انھوں نے ۷۲۷۵ احادیث کو اپنی شروط کے مطابق پایا۔ باقی کو مسترد کر دیا۔ ان میں سے اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو باقی روایات کی تعداد ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔ انھیں امام بخاری کی احادیث کہا جاتا ہے۔

اس طریق سے جمع کردہ روایات میں غلطیاں کس انداز سے ہوتی ہیں۔ ان کے متعلق مودودی صاحب نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ روایت میں سب سے پہلے بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ فلاں صحابیؓ نے کہا کہ رسول اللہ نے یوں ارشاد فرمایا تھا۔ اس ضمن میں مودودی صاحب (بخاری کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے) لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب کی تنقید

> ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبیؐ کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہوں گے .... اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں سے بعض کو بعض روایات نے صاف کر دیا ہے اور بعض صاف ہونے سے رہ گئیں۔ زبانی روایات میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔
>
> (ترجمان۔ احادیث نمبر۔ مورخہ ۱۴ ۲/۱۹۵۵)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک سلسلۂ روایات کی پہلی کڑی میں ہی غلط فہمیوں کی گنجائش تھی۔ اب رہیں بعد کی کڑیاں، سو اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

> بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہیئے لیکن ہر شخص باد نیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کی نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس پر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان ایک سرمو فرق نہ پایا جائے۔ اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا۔ مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھیئے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے

کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو بلفظہٖ نقل کرے گا۔ کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں ٹھیک طرح نہ ادا کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی وہ نقل روایت میں غلطیاں کرے گا۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۹-۳۳۰)

یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے۔ آپ خیال فرمائیے کہ اس انداز سے مرتب شدہ احادیث میں سے کسی حدیث کے متعلق کبھی بھی اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ من و عن رسول اللہؐ کا قول ہے؟ یہ بھی واضح ہے کہ احادیث کے متعلق یہ کسی کا بھی عقیدہ نہیں کہ وہ رسول اللہؐ کے الفاظ ہیں۔ جو راویوں نے آگے منتقل کئے ہیں۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہؐ کے الفاظ کا مفہوم ہیں۔ یعنی رسول اللہؐ نے کچھ فرمایا۔ سننے والے صحابیؓ نے حضورؐ کے الفاظ کا جو مفہوم سمجھا اسے اپنے الفاظ میں آگے بیان کیا۔ اس نے اس صحابیؓ کے الفاظ سے جو مطلب سمجھا اسے اپنے الفاظ میں آگے روایت کیا۔ اس طرح یہ مفہوم، مختلف راویوں کے الفاظ میں آگے منتقل ہوتا چلا گیا تا آنکہ آخری راوی کا بیان، حدیث کے مجموعہ میں شامل کر لیا گیا۔

فرض کر لیجئے کہ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد، کسی حدیث کے متعلق اس پر اتفاق ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح ہے

ہر صحیح حدیث بھی واجب العمل نہیں

سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بعد وہ حدیث سب کے نزدیک واجب العمل ہو جائے گی؟ آپ کہیں گے کہ اس میں اب کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ اسے واجب العمل ہو جانا چاہیئے۔ لیکن نہیں۔ اس کے بعد ابھی ایک مرحلہ باقی ہے۔

جماعت اسلامی سے جو حضرات الگ ہوئے تھے۔ انھوں نے مودودی صاحب کے خلاف ایک الزام یہ بھی عاید کیا تھا کہ وہ جب تک نظری سیاست کی منزل میں رہے، دین کے مطابق اصولوں کی تبلیغ کرتے رہے لیکن جب عملی سیاست کا وقت آیا تو کچھ اور ہی روش اختیار کر لی۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے لکھا کہ یہ بات کچھ میں نے انوکھی نہیں کی۔ (معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ نے بھی یہی کیا تھا۔ حضورؐ ساری عمر اخوت و مساوات کے اصولوں کی تبلیغ فرماتے رہے لیکن جب عملاً تشکیل حکومت کا وقت آیا تو آپؐ نے فرما دیا "الائمۃ من قریش" خلافت قریش میں رہے گی۔ مودودی صاحب کے فریق مقابل (مولانا امین احسن صاحب اصلاحی) "الائمۃ من قریش" والی حدیث کو صحیح مانتے ہیں۔ لیکن انھوں نے کہا کہ رسول اللہؐ کا یہ حکم مستقل نہیں تھا۔ آپؐ نے ایک تقیہ کا وقتی فیصلہ دیا تھا۔ اور

ایک مستقل حکم دینے اور کسی قضیہ کا وقتی فیصلہ کرنے میں (بڑا باریک) فرق ہوتا ہے۔

(میثاق - دسمبر ۱۹۵۹ء)

اس اصول کو خود مودودی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ ان سے جب (ضبط ولادت کے سلسلہ میں) عزل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ

> عزل کے متعلق جو کچھ آنحضورؐ سے پوچھا گیا اور اس کے جواب میں جو کچھ حضورؐ نے بیان فرمایا اس کا تعلق صرف انفرادی ضروریات اور استثنائی حالات سے تھا...... عزل کی اجازت کی جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوری بیان کی اور آنحضورؐ نے انھیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔
>
> (ترجمان القرآن بابت اپریل سنہ ۱۹۶۰ء)

لہٰذا جس حدیث کو فریقین صحیح تسلیم کر لیں، اس کے متعلق بھی یہ سوال پیدا ہوگا کہ حضورؐ کا وہ حکم مستقل تھا یا آپؐ نے ہنگامی استثنائی یا انفرادی قضیہ کا فیصلہ کرنے کے لئے ایسا ارشاد فرمایا تھا۔ آخر الذکر کی صورت میں اس حکم کی اطاعت لازم نہیں آئے گی۔ اب سوچئے کہ اس کا فیصلہ کس طرح سے ہوگا کہ حضورؐ کا فلاں حکم مستقل نوعیت کا تھا یا ہنگامی اور انفرادی حیثیت رکھتا تھا؟ چنانچہ اصلاحی صاحب "الائمۃ من قریش" کے حکم کو ہنگامی قرار دیتے ہیں اور مودودی صاحب مستقل۔ اسی طرح مودودی صاحب عزل کی اجازت کو انفرادی قرار دیتے ہیں اور ان کے فریق مقابل اسے عام اجازت تصور کرتے ہیں۔

حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے

آپ کہیں گے کہ حدیث کو پرکھنے کا سیدھا اور صاف طریقہ یہ ہے کہ جو حدیث، قرآن کریم کے خلاف جائے اُسے غلط قرار دیدیا جائے۔ یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے لیکن ہمارے علمائے کرام کا عقیدہ اس باب میں کچھ اور ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حدیث قرآن کریم کے خلاف بھی ہو سکتی ہے اور جب قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو تو حدیث قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے۔ چنانچہ علامہ مولوی حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی اپنے کتابچہ "فتنۂ انکار حدیث" میں لکھتے ہیں۔

> نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب تو حجت ہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے...... جس طرح قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ اسی طرح نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو (ص ۲)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

> رہی یہ بات کہ قول رسول قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (۲:۱۸۰) "تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔" رسول اللہ نے فرمایا لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ <u>حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا</u>۔ اور قول رسول، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص ۸۵)

اس کے بعد وہ اس کی علت سمجھاتے ہیں۔

> اب اگر یہ کہا جائے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول کا قول قرآن کو منسوخ کر دے۔ تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رسول کا قول اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول کا قول بھی خدا کا قول ہے۔ اور جس طرح قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قول رسول) دوسرے قول۔ یعنی قرآن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (ص ۸۶)

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک قرآن کی بہت سی آیات ہیں جنہیں یا تو قرآن کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیا ہے یا حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔ اب ان آیات کی صرف تلاوت ہوتی ہے۔ ان پر عمل نہیں ہوتا۔

قرآن مکمل دین نہیں

ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اصولی طور پر بھی قرآن کریم دین کا مکمل ضابطہ نہیں۔ حدیث کی پوزیشن مثلہ معہ ہے۔ یعنی قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں۔

> حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے۔ یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر کیا ہے۔ اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے۔۔۔۔۔ مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۵۸ء)

اس مقام پر مودودی صاحب سے یہ پوچھا گیا کہ جب دین کی تکمیل قرآن اور حدیث' دونوں کے مجموعے سے ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں' قرآن ہی میں کیوں نہ بیان کر دیا تاکہ امت کے پاس دین کا مکمل اور محفوظ ضابطہ موجود ہوتا۔ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ

> اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔
>
> (تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۳۲)

یوں "دین کے ایک غیر متبدل' ابدی حصہ" کو قرآن سے باہر احادیث کے اندر رکھ دیا گیا اور احادیث کے مجموعوں سے اسے تلاش کرنے کا فریضہ "مزاج شناس" کی نگرِ بصیرت کے سپرد کر دیا گیا۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! احادیث کی پوزیشن ہمارے علمائے کرام کے اپنے الفاظ میں۔ ہم نے ہر اقتباس کے ساتھ حوالہ نقل کر دیا ہے تاکہ یہ نہ کہہ دیا جائے کہ ہم نے کچھ اپنی طرف سے لکھ دیا ہے یا توڑ مروڑ کر پیش کر دیا ہے۔ آپ ان حوالوں سے اصل عبارات نکال کر دیکھ لیں اور سیاق و سباق سے ملا کر اپنا اطمینان کر لیں۔

اتنا اور واضح کر دیا جائے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ سنی حضرات کا عقیدہ ہے۔ شیعہ حضرات سنیوں کی احادیث کے مجموعوں کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان کی احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ایک مستفسر کے جواب میں لکھتے ہیں۔

> آپ کو جو اس بات پر تعجب ہے کہ آخر واضح احادیث کی موجودگی میں وہ (شیعہ حضرات) کیونکر اپنی ہٹ پر قائم رہ سکتے ہیں تو آپ کو یہ تعجب غالباً اس غلط فہمی کے سبب سے ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ حدیث کی جن کتابوں کو آپ مستند و معتبر مانتے ہیں یہ حضرات بھی ان کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ذہن میں یہ خیال رکھتے ہیں تو اس خیال کو ذہن سے نکال دیجئے۔ ان حضرات کی حدیث و فقہ پر جیسے کے اپنے مجموعے ہیں جو ان کے اپنے خاص ذرائع سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ انہی کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ ان مجموعہ ہائے احادیث کو یہ کوئی وزن نہیں دیتے جو ہمارے ہاں معتبر ہیں۔
>
> (میثاق بابت مئی سنہ ۱۹۶۰ء)

ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ان حضرات کا یہ کہنا کہ دیکھئے! ہم نے متفق علیہ مطالب پیش کر دیا ہے کہ آئینِ پاکستان کی بنیاد کتاب و سنت پر ہونی چاہیئے۔ اس لئے اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں اتنے فرقے موجود ہیں اور فرقوں میں اس قدر باہمی اختلاف ہے۔ اس لئے ہم متفق علیہ اسلامی آئین کس طرح بنا سکتے ہیں۔ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ یہ حضرات یہ کہہ کر خوش ہو جاتے

ہیں کہ ہم نے اس مشکل مسئلہ کو یوں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ "سنت" کے معاملہ میں ان کے باہمی اختلافات بنیادی ہیں اور جس بات کو ایک فرقہ یا فرد سنت قرار دیتا ہے، دوسرا اسے سنت سمجھتا ہی نہیں۔ یعنی ان کا اس بنیاد پر بھی اتفاق نہیں کہ "سنت" کہتے کسے ہیں؟ اور وہ کس کتاب میں ہے؟ یہ حضرات اس وقت تو لیپا پوتی سے کام لے سکتے ہیں لیکن جب کل عملاً یہ سوال سامنے آیا کہ فلاں قانون مطابق سنت ہے یا نہیں؟ تو اس متفق علیہ مطالبہ کی قلعی کھل جائے گی۔ اس وقت ان میں سے ہر ایک کا فیصلہ الگ الگ ہوگا۔ ان حضرات کو اس حقیقت کا خود احساس ہے۔ اس کا انھوں نے حل یہ سوچا ہے کہ آئین میں یہ شق رکھ دی جائے کہ شخصی قانون (PERSONAL LAW)

شخصی قانون

میں قرآن و سنت کی تعبیر وہی لی جائے جو متعلقہ فرقے کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ (ہم اس سوال کو ذرا آگے چل کر سامنے لائیں گے کہ قرآن کی رو سے شخصی اور ملکی قانون کی تفریق ہی غلط ہے۔ سردست یہ دیکھئے کہ) اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شخصی قانون کی صورت میں ہر فرقہ کی الگ الگ تعبیر قابلِ قبول ہوگی تو ملکی قانون کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا۔ اس لئے کہ کتاب و سنت کی مطابقت کی شرط ملکی قانون پر بھی اسی طرح عاید ہوگی جس طرح شخصی قانون پر۔ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں ملکی قانون مطابقِ سنت ہے یا نہیں جبکہ ملک کے سامنے سنت کی کوئی جامع تعریف یا کتاب ہی نہیں ہوگی۔ ان حضرات نے یہ مطالبہ پیش کر کے کہ شخصی قانون میں ہر فرقہ کی "کتاب و سنت" کی الگ الگ تعبیر تسلیم کر لی جائے، اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ کتاب و سنت سے شخصی قوانین بھی ایسے نہیں بنائے جا سکتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوں۔ اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کتاب و سنت سے شخصی قوانین بھی متفق علیہ نہیں بن سکتے (یعنی کتاب و سنت کی رو سے نکاح اور طلاق وغیرہ سے متعلق قوانین بھی ایسے نہیں بن سکتے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہوں) تو اسی کتاب و سنت کی رو سے متفق علیہ ملکی قوانین کس طرح بن سکیں گے؟ حضرات علمائے کرام نے نہ اپنے سابقہ مطالبہ میں اس کی تصریح فرمائی تھی اور نہ اب ہی اس کے متعلق اشارہ تک کیا ہے؟

یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق یہ حضرات آئین جیسے اہم اور پیچیدہ مسئلہ کی اس بنیادی شق سے یوں آنکھیں بند کر کے گزر جانا چاہتے ہیں۔ اور جو شخص حقائق کا سامنا کرنے کے بعد ان سے دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا حل کیا ہے اس کے متعلق شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں باادب گزارش کریں گے کہ اس قسم کی ہنگامہ آرائی سے ایسے اہم مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ یہ آئین کا بنیادی مسئلہ ہے جس کا حل آپ کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے۔ اگر آپ حضرات، طلوع اسلام کو گالیاں دینے کے بجائے، اس تمام عرصہ میں

کرنے کا کام

(۱) "سنتِ رسول اللہ" کی ایسی تعریف (DEFINITION) مرتب کر دیتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوتی۔ اور

(۲) کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر دیتے جس میں پوری کی پوری سنت رسول اللہ درج ہوتی اور اس کتاب کا متن سب کے نزدیک قرآن کریم کے متن کی طرح متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہوتا پھر بھی آپ کہہ سکتے کہ ہم نے ایک متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے۔ لیکن جب حقیقت یہ ہو کہ مطالبہ پیش کرنے والے اس خشتِ اول ہی پر متفق نہ ہوں کہ سنت کہتے کسے ہیں اور وہ کہاں سے ملے گی تو ان کے مطالبہ کو متفق علیہ کہنا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ کچھ دیکھ کر آپ یقیناً سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گے اور بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی آئین مرتب ہو ہی نہیں سکتا، وہ سچے ہیں۔ ۱۹۵۶ء کا آئین جسے اسلامی کہہ دیا گیا تھا، ایک دن بھی نہیں چل سکتا تھا۔ اور اگر اب پھر اسی قسم کا آئین بنا دیا گیا تو وہ بھی ایک دن نہیں چل سکیگا۔ لہٰذا کشود کی راہ یہی ہے کہ ان خار دار جھاڑیوں سے الگ رہتے ہوئے، جس طرح باقی دنیا اپنا اپنا آئین بناتی ہے، ہم بھی ویسا ہی آئین بنا لیں۔

سیکولر آئین

اسلامی آئین کا جو تصور ہمارے علمائے کرام پیش کرتے ہیں، اس کے پیشِ نظر کوئی شخص مندرجہ بالا نتیجہ کے سوا کسی اور نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ علمائے کرام کا یہی انداز تھا جس سے تنگ آکر ترکی کو سیکولر آئین اختیار کرنا پڑا تھا۔ اور یہی وہ دقت ہے جس کا حل سامنے نہ ہونے سے پاکستان میں سیکولر آئین کی آوازیں کان میں پڑ رہی ہیں۔
لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ صحیح اسلامی آئین، جو حقائق کی روشنی میں قابلِ عمل ہو، مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے

مسئلہ کا حل

مرتب کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ آئین کے معاملہ میں اسلام کا منشاء کیا ہے۔ طلوعِ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ خدا اور رسول کا منشاء یہ تھا کہ اسلامی آئین کی بنیاد قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر رکھی جائے جن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مملکت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کاروبار چلائے۔ علمائے کرام کا کہنا یہ ہے کہ آئین کی بنیاد کتاب و سنت یا قرآن اور حدیث پر رکھی جائے اور دونوں کو غیر متبدل اور ابدی قرار دیا جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے ساتھ احادیث کو بھی دین کا ابدی اور غیر متبدل حصہ قرار پانا تھا تو
(۱) کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ضروری نہیں تھا کہ جس طرح اس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لیا تھا، احادیث کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا۔ اور
(۲) کیا نبی اکرمؐ کا یہ فریضۂ رسالت نہیں تھا کہ آپ قرآن کے ساتھ اپنی احادیث کا مجموعہ بھی امت کو دے کر جاتے تاکہ یہ دونوں چیزیں امت کے پاس متفق علیہ طور پر ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتیں اور اس قسم کا کوئی الجھاؤ پیدا نہ ہوتا جو حدیث کے بارے میں گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آیا ہے؟ جب رسول اللہ نے ایسا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تو اس سے انسان لامحالہ دو نتیجوں میں سے کسی ایک پر پہنچتا ہے۔ یعنی

منشائے نبویؐ

(۱) یا تو (معاذ اللہ، معاذ اللہ) حضورؐ سے سہواً یہ کام رہ گیا۔

(۲) اور یا حضورؐ نے دانستہ ایسا کیا

پہلے نتیجہ کا تو کوئی مسلمان تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے دوسری بات ہی باقی رہتی ہے کہ منشائے رسالت ہی یہ تھا کہ امت قرآن کریم کی راہ نمائی میں آگے چلے۔ چنانچہ واقعات خود اس کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً

(۱) مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ (مجھ سے (کچھ) نہ لکھو اور جس شخص نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو وہ اسے مٹا دے)۔ اس سے ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ نے خود تو قرآن کریم کی کتابت کرائی تھی۔ احادیث کو لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔ خود یہ واقعہ کہ حضورؐ نے احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا اس کا بیّن ثبوت ہے کہ حضورؐ نے احادیث کی کتابت نہیں کرائی تھی۔

(۲) بخاری میں حضرت عبد العزیز بن رفیع سے روایت ہے کہ میں اور شداد بن معقل حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر شداد بن معقل نے ان سے دریافت کیا "کیا آنحضرتؐ نے کوئی چیز چھوڑی تھی؟" انھوں نے جواب دیا "آپ نے مابین الدفتین (یعنی مجلد قرآن کریم) کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا۔ عبد العزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں محمد بن حنفیہؓ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بھی یہی بات دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ "آپ نے مابین الدفتین کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا۔"

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے وقت قرآن کریم مدون (کتابی) شکل میں نہیں تھا۔ اسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں جمع اور مرتب کیا گیا تو یہ خیال خود قرآن کریم اور واقعات کے خلاف ہے۔ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم اسی شکل میں جس میں وہ اس وقت ہمارے پاس موجود ہے، امت کو دیا تھا۔ اور قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز امت کو نہیں دی تھی۔

خلفائے راشدینؓ کا عمل

نبی اکرمؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ کا زمانہ آتا ہے۔ اس دور کے متعلق علامہ محمد الخضری مصری (مرحوم) اپنی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی (اردو ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین) میں لکھتے ہیں۔

(۳) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مراسیل ابن ابی ملیکہ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں تم لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے اور تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا تو رسول اللہؐ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے۔ اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔ (ص ۱۶۱)

اس کے بعد حضرت عمرؓ کا زمانہ آتا ہے۔ اس کے متعلق علامہ خضری لکھتے ہیں۔

(۴) سیوطی نے تنویر الحوالک شرح موطا امام مالکؒ میں ایک روایت میں جس کا سلسلہ حضرت عروہ بن زبیرؓ تک منتہی ہوتا ہے۔ یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے احادیث کو لکھوانا چاہا اور اس بارے میں اصحاب رسول اللہ سے مشورہ کیا تو تمام صحابہؓ نے اس کا مشورہ دیا۔ لیکن وہ ایک ماہ تک خود غیر متیقن طور پر اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک دن انھوں نے یقینی رائے قائم کر لی اور فرمایا کہ میں نے، جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ تم سے تحریر احادیث کا ذکر کیا تھا۔ پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ تم سے پہلے اہل کتاب میں سے بہت سے لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ اور کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کتابوں میں مشغول ہو گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہیں کروں گا۔ اس لئے انھوں نے تحریر احادیث کا کام چھوڑ دیا۔ (ص ۱۶۳)

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ صورت حالات یہ نہیں کہ عہد رسالت مآبؐ اور دور خلافت راشدہؓ میں جمع و تدوین احادیث کا کام سہواً رہ گیا تھا۔ اور بعد میں امام بخاریؒ وغیرہ نے اسے پورا کر کے دین کے اہم ایک جزو کو محفوظ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اسے دین کا ابدی جزو قرار ہی نہیں دیا تھا اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اسے ایسا سمجھا تھا۔ یہ خیال بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر یہ دین کا ابدی اور غیر متبدل حصہ ہوتا تو عہد رسالت مآبؐ اور زمانہ خلافت راشدہؓ میں اسے محفوظ کیوں نہ کر دیا جاتا؟ نبی اکرمؐ نے امت کو قرآن کریم ہی دیا تھا اور اسی پر اسلامی مملکت (خلافت راشدہؓ) نے اپنے "آئین" کی بنیاد رکھی۔ اس لئے کہ جیسا کہ مودودی صاحب نے بھی لکھا ہے۔

قرآن کی پوزیشن

دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو مدیات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔

(تفہیمات۔ جلد اول۔ ص ۳۳۹)

وہ رسائل و مسائل میں لکھتے ہیں۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انھیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارتاً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ان علینا للھدیٰ۔ (ص ۳۴)

وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن (ص ۵۵۰) میں لکھتے ہیں۔

حرام اور حلال ۔۔۔ جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا۔ اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا یہ سب خداوند ہی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

اس حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات حصہ دوم (ص ۳۸۹) میں لکھتے ہیں۔

اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابو داؤد نے سلمان فارسی سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ماحرم اللہ فی کتابہ۔ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تو وہ معاف ہیں۔

قرآن کریم کا انداز بیان ایسا صاف، سیدھا اور واضح ہے کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں

قرآن کریم اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کے لئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت اپریل۔ مئی سنہ ۱۹۵۵ء)

قرآن کے سمجھنے کے لئے کسی تفسیر کی بھی ضرورت نہیں۔

قرآن کے لئے کسی تفسیر کی بھی حاجت نہیں۔ اس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو (تنقیحات۔ صـ ۱۹۳)

قرآن کو خود قرآن سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی فرماتے ہیں۔

قرآن کے اندر اسرار حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے۔ لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن ہی کے ارشادات والفاظ ہیں۔ قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے۔ ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق وسباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبر کرتے ہیں وہ بقدر استعداد اس سے فیض پاتے ہیں۔ وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق ونظام سے دلیل لاتے ہیں۔

(ترجمان القرآن بابت فروری سنہ ۱۹۵۵ء)

اب اس سلسلہ میں ہمارے سامنے وہ اہم سوال آتا ہے جو اکثر ذہنوں کے لئے پریشانی کا موجب بنتا ہے۔ وہ سوال

دین کی جزئیات

یہ ہے کہ قرآن کریم نے اکثر و بیشتر دین کے اصول دیئے ہیں۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ یہ جزئیات نبی اکرمؐ نے متعین فرمائیں۔ اگر سنت رسول اللہ کو آئین کی بنیاد قرار دیا جائے تو ان جزئیات کو کہاں سے لیا جائے گا۔

اس سلسلے میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جب دین کے صرف اصول دیئے اور ان کی جزئیات کو خود متعین نہیں کیا تو کیا اس نے ایسا دانستہ کیا تھا یا یہ (معاذ اللہ) سہواً رہ گیا تھا؟ اس سوال کا جواب ہم سے نہیں بلکہ مودودی صاحب کی زبان قلم سے سنئے۔ وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن (جلد اوّل) کے صفحات ۵۰۷-۵۰۸ پر لکھتے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدود فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنہا۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض تم پر عائد کئے ہیں انھیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی ہے۔ لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔

ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی یا جو احکام بہ سبیل اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی تفصیلات بتانی چاہئیں تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعینات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصل، مطلق کو مقید، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے (یہودیوں نے ایسا ہی کیا) جن کے نقش قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد صلعم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے ان اصولوں کی جزئیات و تفصیلات خود نہیں بتائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "وہ ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔ اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔" خدا کی آخری کتاب کے لئے جسے اقوام عالم کے لئے ہر ملک اور ہر زمانے میں ہمیشہ ضابطہ حیات بننا تھا، ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسے زندگی کے ایسے اصول دینے چاہئیں تھے جو ہر زمانے میں نوع انسان کے لئے راہ نمائی کا کام دے سکیں اور ان کی جزئیات کو چھوڑ دینا چاہیئے تھا تاکہ ہر زمانے کے لوگ

اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان جزئیات کو خود مرتب کریں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے اور ان کی چار دیواری کے اندر مرتب کردہ جزئیات میں حسب ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی۔ اس طرح ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ انسانیت زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا۔ علامہ اقبالؒ اس ضمن میں اپنے خطبات (تشکیل جدید) میں رقمطراز ہیں۔

جزئیات غیر متبدل نہیں ہوتیں

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر تشکیل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں ...... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

قرآن کریم کے ان غیر متبدل اصولوں کی جزئیات سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب فرمائیں۔ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھا جانا، نہ مقصودِ دین تھا، نہ منشائے رسالت۔ یہ وجہ تھی کہ حضورؐ نے ان جزئیات کو مدون کر کے ان کا مجموعہ امت کو نہ دیا۔ اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ایسا کیا۔ اس کے برعکس ہمیں تاریخ میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ان جزئیات میں رد و بدل کیا گیا۔ (طلوعِ اسلام اس باب میں اس سے پہلے اس قدر تفصیل سے لکھ چکا ہے کہ اس مقام پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات ان تفاصیل کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ "اسلام میں قانون سازی کا اصول" دیکھ لیں) علامہ اقبالؒ اس باب میں لکھتے ہیں۔

> احادیث کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ

معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انھیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کرے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انھیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کرلیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انھیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انھیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے، ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں ہو سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے

طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مصنفین میں ہوتا ہے۔

(خطبات اقبال صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۳)

نبی اکرمؐ کے زمانے کے احکام میں تغیر و تبدل کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب اور جزئیاتِ دین

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں۔ ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے۔ جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ...... پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا ہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔

(تفہیمات حصہ دوم۔ ص ۳۲۷)

وہ اسی کی تفصیل میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

سیرتِ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کبیرہ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہم ظاہر اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسولؐ کا یہ مفہوم جڑ سرے سے غلط ہے اور اکثر دین دار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہبِ صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ ـــــــ تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی بس اس کو ہم بالکل متحجر (FOSCILISED) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں۔ ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت

اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دور انحطاط کی کئی صدیوں سے تقلید مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط ہے درحقیقت روح اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم چلتے پھرتے آثار قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے روک کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے کہ ہم کو "خیر امت" جو بنایا گیا ہے تو اس لئے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (REAR GUARD) کی حیثیت میں لگے رہیں، بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے "خیر امت" ہونے کا راز "اخرجت للناس" میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہؐ اور آپ کے اصحابؓ کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیئے یہ ہے کہ انہوں نے قوانین طبعی کو قوانین شرعی کے تحت کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی ـــ پس نبیؐ اور اصحاب نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانین طبعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیب اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدر اول میں کی گئی تھی۔ پستی اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔　　(نشانِ راہ۔ صفحہ [illegible])[1]

دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ "عبادات" کے علاوہ دیگر احکام کی جزئیات ہم خود متعین کر سکتے ہیں۔

اب رہے دوسرے احکام، تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں بعض

---

[1] اس وقت اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ حوالہ میں کچھ فرق رہ گیا ہو۔

ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضورؐ سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہد نبوی کے قوانین مدنی، اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں۔ دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق وہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہیئے۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۳۳)

طلوع اسلام کی دعوت یہ ہے کہ آئین پاکستان کی اساس (بنیاد) قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کو قرار دیا جائے اور ان اصولوں

طلوع اسلام کی دعوت

کی جزئیات مرتب کرتے وقت ہم اس تمام ذخیرہ کو اپنے سامنے رکھیں جو اسلاف سے ہم تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس میں جو کچھ ایسا ہو جو ہماری ضروریات کو آج بھی پورا کرتا ہے اسے علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو اس میں تبدیلی کر لی جائے اور جو نئے معاملات سامنے آئیں ان کے لئے نئی جزئیات مرتب کر لی جائیں۔ مودودی صاحب اس باب میں لکھتے ہیں۔

اب اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو صحابہ یا ائمہ کے دور میں پیش نہیں آیا، یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اس دور میں موجود ہی نہ تھی تو اس کے متعلق متقدمین کے اجتہادی احکام میں کوئی حکم تلاش کرنا بداہتہً غلط ہے۔ ایسے ہر حادثے اور ہر چیز کے لئے ہم کو بھی اسی طرح اصول و کلیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس طرح صحابہ اور ائمہ نے اپنے عہد کے حوادث میں کیا تھا۔

(تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۳۹۲)

مولانا اصلاحی کا مسلک یہ ہے کہ قرآن ہی میں نہیں بلکہ حدیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں اور جزئیات کا تعین امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

قرآن و حدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اور اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات سے ان میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ اس خلاء کو حالات و ضروریات کے تحت پیش آنے والے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام کے منشاء اور مزاج کے مطابق قوانین بنانا امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۵۸ء)

نگہِ بازگشت

سنت رسول اللہ کے متعلق جو کچھ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ

(۱) "سنت کسے کہتے ہیں" اس کے متعلق یہ حضرات آپس میں متفق نہیں۔

(۲) ایسی کوئی کتاب نہیں جس میں سنت رسول اللہ بہ تمام و کمال درج ہو اور جس کا متن، تمام مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم کے متن کی طرح "متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو۔ حتیٰ کہ حدیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۳) مولانا اسمٰعیل صاحب (اور ان کے ہم مکتب علمائے اہل حدیث) کا مسلک اور عقیدہ یہ ہے کہ دین کی جزئیات بھی خدا کی طرف سے بذریعہ وحی رسول اللہ کو عطا ہوئی تھیں۔ یہ جزئیات احادیث کے مجموعہ، بخاری و مسلم میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے کسی حدیث کا انکار بھی کفر ہے اور کسی نئی بات کا اختیار کرنا بدعت۔ اسی کا نام سنت رسول اللہ ہے۔

(۴) مودودی صاحب کے نزدیک ہر حدیث سنت نہیں۔ سنت وہ ہے جسے رسول اللہ نے بہ حیثیت رسول فرمایا یا کیا ہو۔ اس کا فیصلہ مزاج شناس رسول کی نگہ بصیرت کر سکتی ہے کہ احادیث کی کتابوں میں جو کچھ آیا ہے اس میں کونسی حدیث صحیح اور کون سی غلط ہے۔ اور صحیح حدیثوں میں سے کون سی بات نبی اکرم نے بہ حیثیت رسول کی تھی اور کون سی اپنی شخصی حیثیت سے۔ جو باتیں حضورؐ نے بہ حیثیت رسول کی تھیں انہیں بھی بجز عبادات کے، ہو بہو قائم رکھنا مقصود نہیں۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ اور نئے حوادث کے سلسلہ میں جدید جزئیات بھی مرتب کی جا سکتی ہیں۔ اور

(۵) مولانا اصلاحی صاحب کے نزدیک، قرآن و حدیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنا امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو جزئیات رسول اللہ نے مرتب فرمائی تھیں ان میں سے سنت وہ باتیں جنہیں حضورؐ نے استمرار کیا ہو، ہنگامی حالات میں وقتی فیصلوں کے طور پر ارشاد نہ فرمایا ہو۔ اس کا فیصلہ کہ حضورؐ نے کون سی بات استمرار کی تھی اور کون سی ہنگامی حالات کے ماتحت، غالباً خود اصلاحی صاحب یا ان کے ہم مسلک حضرات کریں گے۔

"سنت" کے مفہوم کے متعلق اس قدر بایمعہ اختلافات کے باوجود، ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ ہم نے آئین پاکستان کے متعلق متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے! اصل یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک قدر مشترک صرف لفظ "سنت" ہے۔ اس کا مفہوم ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے۔ اگر طلوعِ اسلام چاہتا تو وہ بھی نہایت دھڑلے سے کہہ دیتا کہ آئین پاکستان کی بنیاد واقعی کتاب و سنت پر ہونی چاہیئے اور جب کوئی پوچھتا تو (مودودی صاحب کی طرح) کہہ دیتا کہ ہمارے نزدیک سنت وہی ہے جسے ہماری نگہ بصیرت سنت کہہ دے۔ اس طرح ان حضرات سے "سنت" کے مطالبہ کی ہمنوائی سے وہ بھی انہی کی طرح "حامیٔ سنت" قرار پا جاتا اور اس کے خلاف کوئی طوفان برپا نہ ہوتا۔ لیکن طلوعِ اسلام دین کے معاملہ میں اس قسم کے کھیل کھیلنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اللہ اس سے ہر ایک کو محفوظ رکھے۔

مولانا اسمٰعیل صاحب سے ایک سوال

اس مقام پر ہم (مثلاً جماعت اہل حدیث کے نمائندہ) مولانا اسمٰعیل صاحب سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اس وقت تو آپ مطمئن ہیں کہ (مثلاً) مودودی صاحب نے "کتاب و سنت" کے مطالبہ میں آپ سے اتفاق کر لیا ہے۔ لیکن کل کو اگر پاکستان میں کوئی قانون نافذ ہوا اور اس کے متعلق سوال پیدا ہوا کہ آیا وہ قانون "سنت" کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور مودودی صاحب نے اسناد سے بے نیاز ہو کر اپنی تنگ بصیرت کے مطابق ایک حدیث پیش کر دی، تو کیا آپ اُس حدیث کو صحیح حدیث تسلیم کر لیں گے اور اُسے "سنت" قرار دیدیں گے؟

مودودی صاحب سے بھی

یہی سوال ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر اُس وقت مولانا اسمٰعیل صاحب نے بخاری کی کوئی حدیث پیش کر دی تو کیا آپ اسے صحیح حدیث تسلیم کر لیں گے اور اسے واجب الاطاعت "سنت رسول اللہ" قرار دیدیں گے؟

یہی سوال مختلف فرقوں کے ان نمائندوں سے پوچھا جا سکتا ہے جنہوں نے اس متحدہ مطالبہ پر دستخط کئے ہیں کہ کیا وہ اُس وقت کسی دوسرے فرقے کی طرف سے پیش کردہ حدیث کو صحیح تسلیم کر لیں گے؟

آپ حضرات کی طرف سے اس سوال کے جواب کے لئے طلوع اسلام کے صفحات کھلے ہیں۔

اس کے برعکس، اگر قرآن کریم کو آئین کی بنیاد قرار دیا جائے اور اس وقت کسی فرقے کی طرف سے قرآن کی کوئی آیت پیش کی جائے تو کوئی فرقہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ قرآن کی آیت نہیں۔

قرآن کی تعبیر میں اختلاف

اس مقام پر یہ کہہ دیا جائے گا کہ قرآن کی آیت کے قرآنی آیت ہونے میں تو کچھ اختلاف نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی تعبیر میں تو اختلاف ہوگا؟ چونکہ اس سوال کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے (بلکہ یوں کہیئے کہ اسے یہ کہہ کر اچھالا جاتا ہے کہ اگر قرآن کریم کو قانون کی بنیاد قرار دے لیا تو امت میں جو کچھ رہا سہا اتحاد باقی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا) اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق ذرا وضاحت سے بات کی جائے۔

(۱) قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کے لئے ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ سورۂ نساء میں ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا
فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ؟ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت اختلافات پاتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ دو مختلف باتوں کو قرآن کریم سے سند یا تائید مل ہی نہیں سکتی۔

(۲) اس نے کہا ہے کہ وہ آیا ہی اختلافات مٹانے کے لئے ہے۔

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے لئے وہ باتیں واضح طور پر بیان کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ (یوں) یہ قرآن ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو اس کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۳) وہ تاکید کرتا ہے کہ جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس کے لئے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرو۔ تمہیں وہاں سے حتمی فیصلہ مل جائے گا۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰)

اور تم جس بات میں بھی اختلاف کرو۔ تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہے

(۴) اس کی رو سے اختلاف خدا کا عذاب ہے۔ اس لئے جماعتِ مومنین سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (۳/۱۰۵)

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (خدا کی طرف سے) واضح ہدایت آجانے کے بعد باہمی تفرقہ اور اختلاف کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

قرآن کریم کے ان واضح اعلانات کے بعد یہ کہنا کہ اگر قرآن کو آئین و قوانین کی بنیاد قرار دے لیا تو اس سے اختلافات بڑھ جائیں گے، قرآن کے دعوے سے کھلا ہوا انکار ہے۔ اور اپنے تفرقہ اور اختلافات پر مصر رہنا، اپنے آپ کو عذاب خداوندی میں مبتلا رکھنا ہے۔

قرآن فہمی کا طریق

قرآن کریم نے اپنے سمجھنے کے لئے خود ہی اصول بیان کر دیئے ہیں (ان اصولوں کی طرف مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے اس مضمون میں اشارہ کیا ہے جس کا اقتباس پہلے دیا جا چکا ہے)۔ اگر قرآن کریم کو خود قرآن کریم کے ان کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے احکام و قوانین کے سمجھنے میں اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ جو آپ اس وقت مختلف فرقوں میں اختلاف دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن کریم ان میں سے ہر ایک کو اس کے مسلک کی تائید بہم پہنچا رہا ہے اگر ایسا ہو تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا دعوے ہی (معاذ اللہ) باطل قرار پا جاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف فرقے، قرآن کریم کو خارج از قرآن

چیزوں کے تابع رکھتے ہیں یعنی یہ فرقے اپنے احکام و قوانین کو خارج از قرآن سرچشموں سے لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ قرآن کی طرف آتے ہیں۔ اگر انھیں ان احکام و قوانین کی تائید میں قرآن کریم کی کوئی آیت مل جاتی ہے تو اسے بھی تائیداً ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ اگر قرآن کی آیت اس کے خلاف جاتی ہے تو اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اس حکم کے مطابق دکھائی دے۔ اور اگر ایسا ناممکن ہو تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کا حکم منسوخ ہے۔ آپ اصحاب حدیث کا یہ عقیدہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ باقی رہے اہل فقہ (حنفی حضرات) تو ان کے پیشوا اور مسلّم امام ابوالحسن عبید اللہ الکرخی کا یہ قول ان کے عقیدہ کو واضح کرتا ہے کہ

فقہ اور قرآن

ہر وہ آیت جو اس طریقے کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو مأول ہے یا منسوخ ہے اور اس طرح ہر حدیث اس قسم کی ہو وہ مأول یا منسوخ ہے۔ (علامہ الخضری۔ صفحہ ۱۲۱)

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جس چیز کو قرآن کی تعبیر میں اختلاف کہا جاتا ہے وہ درحقیقت قرآن کی تعبیر کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ جن چیزوں کو مختلف فرقوں نے قرآن پر قاضی اور حاکم بلکہ اس کا ناسخ تک قرار دے رکھا ہے وہ ان چیزوں کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف ہوتا ہے فرقوں کی باہمی ضد کی وجہ سے۔

وَآتَيْنَاهُم بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ ۖ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا
جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ...... (۴۵/۱۷)

اور ہم نے انھیں اس معاملہ (دین) کے متعلق واضح باتیں دی تھیں۔ لیکن انھوں نے العلم (وحی) آجانے کے بعد آپس میں اختلاف کیا۔ اور اس اختلاف کی وجہ محض ان کی باہمی ضد تھی۔

اگر فرقہ بندی کی باہمی ضد کو الگ رکھ کر، امت خالص قرآن کی طرف آجائے تو اس کے احکام و قوانین[1] میں کسی قسم کا اختلاف نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے زندگی کے لئے جو ضابطہ عطا فرمایا ہے اگر وہ بھی صاف، واضح اور متعین نہیں تو

---

[1] قرآن کریم میں زندگی کے لئے اصول و قوانین اور احکام بھی ہیں اور حقائق کائنات اور مابعد الطبیعاتی امور بھی۔ جہاں تک اصول و قوانین و احکام کا تعلق ہے انھیں قانون کی زبان میں بیان کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کے ابہام یا ذومعنی ہونے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جہاں تک کائناتی حقائق وغیرہ کا تعلق ہے انھیں قرآن نے تشبیہات و استعارات کی زبان میں بیان کیا ہے تاکہ جوں جوں انسانی علم میں وسعت آتی جائے ان کا مفہوم واضح سے واضح تر ہوتا جائے۔ مثلاً قرآن میں ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ (۴/۲۳) "تم پر تمہاری مائیں حرام قرار دی گئی ہیں"۔ یہ حکم بالکل واضح اور متعین ہے۔ اس میں صرف یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ ماؤں سے مراد حقیقی مائیں ہیں یا سوتیلی مائیں بھی اس کے اندر آجاتی ہیں۔ اس کے لئے اس سے سابق آیت میں کہہ دیا کہ وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ "ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں۔" اس نے بات صاف کر دی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر اس کا اس دعوے کا (معاذ اللہ) کچھ مطلب ہی نہیں کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے صاف۔ واضح۔ مکمل۔ واحد اور آخری ضابطہ حیات ہے۔

فرقہ اہلِ قرآن بعض لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ فرقۂ اہلِ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآنِ خالص سے احکام متعین کرتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی باہمی اختلاف ہے۔ ایسا کہنے والوں کو دراصل اس کا علم نہیں کہ فرقۂ اہلِ قرآن نے کون سی باتیں قرآن سے متعین کرنے کی کوشش کی اور ان میں باہمی اختلاف ہوا! قرآن نے جن امور کو محض اصولی طور پر بیان کیا ہے۔ یہ فرقہ ان کی جزئیات کو بھی قرآن سے متعین کرنے لگ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جو باتیں قرآن میں ہوں ہی نہ، اگر کوئی انہیں بھی قرآن سے متعین کرنے بیٹھ جائے تو ان میں اختلاف نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ جو لوگ یہ متعین کرنا چاہیں کہ قرآن کی رو سے (مثلاً) رکوع میں کون سی تسبیح پڑھنی چاہیئے، ان میں اختلاف کے سوا اور کیا ہوگا۔ فرقۂ اہلِ قرآن کی یہی بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے وہ خود ناکام رہا اور اس کی وجہ سے قرآن بدنام ہوگیا۔ قرآن نے زندگی کے جو اصول واحکام دیئے ہیں، وہ صاف اور واضح ہیں۔ جن جزئیات سے وہ خاموش رہا ہے ان کے متعلق اس کی تعلیم یہ ہے کہ انہیں اُمت باہمی مشورے سے مرتب کرے۔ اس طریق کو اختیار کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہے؟ اس دعویٰ کا زندہ ثبوت خود عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ ہے جس میں اس طریق کو اختیار کیا گیا اور اُمت میں کوئی اختلاف (یا فرقہ) پیدا نہ ہوا۔

اور اگر یہ واقعہ بھی ہو کہ فرقۂ اہلِ قرآن۔ یا کسی اور کو قرآن کریم کے کسی حکم کے سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے تو کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح کر سکے اور اس میں اختلافی باتیں موجود ہیں۔ اس سے تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان ہی نہیں رہتا۔ بہرحال، اتنا واضح ہے کہ قرآن کی صورت میں یہ سوال سامنے نہیں آئے گا کہ فلاں آیت قرآن کی ہے یا نہیں۔ لیکن حدیث کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جس چیز کو حدیث کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے وہ رسول اللہؐ کی حدیث ہے بھی یا نہیں۔ اس کے مفہوم کا سوال بعد

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گزشتہ) دوسری طرف یہ آیت لیجئے کہ کان عرشہ علی الماء (۱۱/۷) اس آیت کا تعلق احکام سے نہیں بلکہ حقائق سے ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے "اس کا عرش پانی پر ہے"۔ اگر ان الفاظ کے عام معنی مراد لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ بادشاہوں کے تختوں کی طرح خدا کا بھی ایک تخت ہے اور وہ پانی پر تیرتا ہے۔ لیکن اگر ان کے مجازی معنی لئے جائیں تو عرش سے مراد خدا کا اقتدار اور کنٹرول ہوگا۔ باقی رہا ماء تو اس کے متعلق قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ جعلنا من الماء کل شیء حی (۲۱/۳۰) "ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا"۔ تو اس کا مطلب ہوگا زندگی کا سرچشمہ اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ زندگی کے سرچشمہ پر کنٹرول خدا کا ہے۔ یہ مثال ہے حقائق سے متعلق قرآن کے انداز کی۔ حقائق کے سمجھنے میں علی قدرِ علم اختلاف ہو سکتا ہے لیکن احکام میں نہیں۔ حقائقِ کائنات کے سمجھنے میں اختلاف سے مملکت میں انتشار نہیں پیدا ہوتا۔ انتشار اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مختلف فرقے اپنے اپنے لئے الگ قوانین تجویز کریں۔ ایسی صورت میں انتشار تو ایک طرف، مملکت قائم ہی نہیں رہ سکتی۔

میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے فرقوں کے اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن باتوں کو ایک فرقہ صحیح احادیث قرار دیتا ہے دوسرا فرقہ انھیں صحیح حدیثیں سمجھتا ہی نہیں۔

شخصی قوانین اب رہا حضرات علمائے کرام کا یہ مطالبہ کہ جہاں تک شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) کا تعلق ہے ہر مسلک فرقہ کو اجازت ہو کہ وہ کتاب و سنت کی تعبیر اپنے عقیدہ کے مطابق کرے اس باب میں گزارش ہے کہ کیا یہ حضرات کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ سے (جسے بھی وہ اپنے عقیدہ کے مطابق سنت سمجھتے ہوں) اس امر کا اشارہ تک بھی پیش کر سکتے ہیں کہ اسلام شخصی قوانین اور ملکی قوانین میں تفریق کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصور اس دور میں پیدا ہوا جب سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا گیا۔ ملکی قوانین، اہل سیاست نے اپنے پاس رکھے اور شخصی قوانین کو مذہبی پیشوائیت کی طرف منتقل کر دیا۔ ہندوستان میں جب انگریزوں کی حکومت آئی تو انھوں نے مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اس کے مطابق انھوں نے ملک کے قوانین اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی معاملات، قانون شریعت کے مطابق طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں، ہمارے ہاں ملکی اور شخصی قوانین کی تفریق زندہ رہی۔ اب خدا کے فضل سے ہماری اپنی آزاد مملکت ہے جس کے لئے اسلامی آئین کی تدوین کا سوال زیرِ غور ہے۔ اس مملکت میں ہمارے علمائے کرام اس ثنویت کو برقرار رکھنے اور مستحکم کرنے کی کوششیں فرما رہے ہیں جو دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی اور انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں پروان چڑھی! یا للعجب۔

اس ثنویت میں مودودی صاحب تو اس حد تک آگے نکل گئے ہیں کہ ان کے نزدیک نماز، روزہ وغیرہ تو دین سے متعلق ہیں اور معاشی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی مسائل کا براہِ راست دین سے تعلق ہی نہیں۔ چنانچہ وہ تنقیحات، حصہ اول، صفحہ ۲۶۹ پر لکھتے ہیں۔

> مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپؐ کے اتباع کا عام حکم دینے سے یہ مراد نہیں کہ آپؐ نے جو کچھ کیا اور جس طرح کیا، لوگ بھی بعینہٖ وہی فعل اسی طرح کریں۔ اور اپنی زندگی میں آپؐ کی حیاتِ طیبہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد قرآن کا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور براہِ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپؐ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپؐ نے حکم دیا ہے اور جس

طرح خود عمل کر کے بتایا ہے۔ اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازمی ہے۔ رہے وہ امور جو براہ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً تمدنی۔ معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے ہم کو مکارم اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے اور ہم آپؐ کے طریقہ کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہتا ہے اور اسی غرض سے آپؐ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لئے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپؐ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہیئے اور کن امور میں آپؐ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کر کے قوانین وضع کرنے چاہئیں اور کن امور میں آپؐ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہئیں۔

فرقوں کا وجود

باقی رہا فرقوں کا وجود، تو قرآن کریم نے بالفاظِ صریح اسے شرک قرار دیا ہے۔ اس نے مسلمانوں سے تاکیداً کہا کہ دیکھنا! تم نے مسلک توحید اختیار کرنے کے بعد کہیں مشرک نہ ہو جانا۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ. مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ (۳۰/۳۲)

تم نے مشرکوں میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے۔ اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے (پھر حالت یہ ہو گئی کہ) تمام فرقے اپنے اپنے مسلک پر اترا رہے ہیں۔

اس نے نبی اکرمؐ سے برملا کہہ دیا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۵۹)

وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہ بن گئے۔ (اے رسولؐ) تیرا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔

ان نصوص صریحہ کی موجودگی میں، فرقوں کی گرہوں کو آئینی طور پر مضبوط کرانے کی کوشش کرنا، آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ کیا کہلائیگی! ہمیں تسلیم ہے کہ آج ہم میں فرقے موجود ہیں، اور یہ بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقے شباشب نہیں مٹ سکتے۔ اس لئے ان کے وجود کو سر دست، اضطراری طور پر گوارا کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم جس قدر جلد ممکن ہو اس "مشرکانہ حالت" سے نکل کر توحید کی منزل میں پہنچ جائیں۔ اس کے لئے اولین قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی طرف پوری امت میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا کرنے کی تجاویز عمل میں لائیں اور اپنا نصاب تعلیم اس انداز کا مرتب کریں کہ ہماری

آنے والی نسلیں خود بخود تفرقہ کی حالت کو چھوڑ کر امت کی وحدت میں گم ہو جائیں۔ اس وقت نہ شخصی اور ملکی قوانین کی تفریق باقی رہے گی۔ نہ عبادات اور معاملات میں فرق کیا جائے گا۔ ایک خدا کی کتاب۔ ایک امت اور ایک نظامِ زندگی لئے ہمیں ملے گا اسلامی معاشرہ۔

فرقوں کے وجود کو بامرِ مجبوری علیٰ حالہٖ رہنے دینے سے مطلب یہ ہے کہ جس جس طریق سے کوئی فرقہ اپنے ہاں نماز وغیرہ ادا کرتا ہے اس میں سرِدست دخل نہ دیا جائے۔ یاد رہے کہ اسلام میں عبادات اور معاملات میں کوئی فرق نہیں۔ عبادت کے معنی احکامِ خداوندی کی اطاعت ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے ہاں مختلف فرقوں نے "عبادت" (بمعنی پرستش) کے طور طریقوں کو اپنا امتیازی نشان قرار دے رکھا ہے اس لئے جب تک فرقوں کا وجود برداشت کیا جائے گا اس وقت تک ان کی "عبادت" کے طور طریق سے بھی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ تاآنکہ کچھ وقت کے بعد ہماری آنے والی نسلیں خود محسوس کر لیں کہ دین میں اس تفریق کی قطعاً اجازت نہیں۔ اس وقت نماز کا بھی ایک ہی طریقہ ہوگا۔ اور جس طرح قرنِ اول میں ہوتا تھا امام، خود حکومت کے سربراہ ہوں گے۔ طلوعِ اسلام کی یہ دعوت بھی کچھ نئی نہیں وہ پہلے دن سے اعلان کرتا چلا آ رہا ہے کہ

> امت کے مختلف فرقے نماز روزہ وغیرہ میں جس جس طریق پر عمل پیرا چلے آ رہے ہیں اس میں رد و بدل کرنے کا حق کسی فرد کو نہیں۔

خود طلوعِ اسلام نے نماز کا کوئی نیا طریقہ وضع نہیں کیا۔ کوئی نئی فقہ ایجاد نہیں کی۔ اس لئے مملکت کے آئین کے بارے میں جو کہا ہے کہ اس کی بنیاد قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر ہونی چاہیئے تو اس لئے کہ وہ ان حقائق سے چشم پوشی نہیں کر سکتا جن کا ذکر سابقہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

آپ حضرات سے ہماری دردمندانہ گذارش ہے کہ آپ بھی ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ جن مختلف الخیال لوگوں نے "کتاب و سنت" کے مطالبہ پر متفقہ طور پر دستخط کئے ہیں (یا جو بعد میں ان کے ہم نوا بنیں گے) جب ملک میں قانون سازی کا وقت آئے گا تو اس وقت یہ کس طرح ایک دوسرے کے مدِمقابل نہیں کھڑے ہوں گے۔ جس حنفی عالم کی آج کیفیت یہ ہے کہ وہ (مثلاً) اہلِ حدیث کے مسنون طریقہ کے مطابق نماز پڑھنے کے لئے تیار نہیں کیا وہ اس کے لئے تیار ہو جائے گا کہ جس ملکی قانون کو اہلِ حدیث مطابقِ سنت قرار دیں، اُسے وہ بھی قانونِ شریعت تسلیم کر لے؟ اُس وقت اگر ارباب حل و عقد نے یہ کہہ دیا کہ آپ حضرات کی اس چپقلش سے ملک کے نظم و نسق کی گاڑی آگے نہیں چل سکتی اس لئے ہم ملکی قوانین کو آپ کے چنگل سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں تو سوچئے کہ اس طرح ملک پر نافذ ہونے والے سیکولر نظام کی ذمہ داری کس پر عاید ہو گی؟ ارباب حل و عقد کو فرنگی مآب، یورپ زدہ، مادہ پرست کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ ایسے حالات میں اور کیا کیا جا سکے گا؟ محض "کتاب و سنت" کا مطالبہ کر دینے سے آپ حضرات

سے اپنے فریضے سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ذرا یہ بھی تو بتا دیجئے کہ اس کے مطابق ملک کی قانون سازی کی عملی شکل کیا ہو گی؟

نماز کی متفق علیہ شکل

جب یہ حقیقت ہے کہ انیس (چھوڑئیے انیس سو) علماء بھی، اور تو اور، نماز تک کی کوئی متفق علیہ مسنون شکل بھی متعین نہیں کر سکتے، تو سوچئے کہ سنت کے مطابق ملک کا متفق علیہ قانون کس طرح سے بن سکے گا؟ ان حالات میں پاکستان میں اسلامی آئین و قوانین کی ترتیب کی ایک ہی شکل

پس چہ باید کرد

ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم کو (جس کے متن کے متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہونے میں کسی کو کلام نہیں) مملکت کی بنیاد قرار دیا جائے اور اس کے احکام و قوانین کی تعبیر میں خارج از قرآن کسی چیز کو قرآن پر حاکم اور قاضی نہ تصور کیا جائے۔ یہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہماری تمام مشکلات کس طرح حل نہیں ہو تیں۔ اس لئے کہ (مودودی صاحب کے الفاظ میں)

> دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو ہر قسم کے شبہات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔
>
> (۲) جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسانی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے اور وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو اشارتاً و کنایتاً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔
>
> (۳) حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا یہ سب خداوند ہی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

لہٰذا اس سے تو امید ہے کہ آپ بھی متفق ہوں گے کہ جو قانون قرآن کریم کے مطابق بنے گا وہ سنت رسول اللہ کے بھی عین مطابق ہو گا۔

دعا کیجئے کہ تاریخ کے اس نازک ترین دور میں اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے اپنے تعصبات، میلانات و رجحانات سے الگ ہو کر ٹھنڈے دل سے حقائق کا جائزہ لیں اور ایسی صورت نہ پیدا ہونے دیں جس سے بروز حشر اسلام ہمیں یہ کہہ کر مطعون کرے کہ تمہاری ضد کی وجہ سے مملکتِ پاکستان میں میرا سکہ رواں نہ ہو سکا۔

ERROR: undefined
OFFENDING COMMAND: f‘~

STACK: